عشق حقیقی

(شعاعِ فکر جناب پروفیسر عبدالغنی خانصاحب چشتی نیازی ایم اے)

تمہید :- اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اگر اپنے لطف و کرم سے اس رسالے کا اجراء فرمایا تو مجھے بے منتِ مخلوق قلمی معاونین بھی ایسے عطا فرما دیئے جو

ع ہم مشرب و ہم مسلک و ہم راز ہیں میرے

پروفیسر صاحب کا یہ مضمون یوں تو سبھی کے لئے فائدہ مند ہے۔ مگر ہم وابستگانِ دامن خواجگانِ چشت کے لئے تو ع ہم صندلِ دردِ سر ہم سرمۂ بینائی کا مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ بطفیل حضرات خواجگان چشت وارثان بہشت میرے دینی بھائی کو صحت و عافیت اور اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال فرمائے تاکہ وہ دین کی خدمت میں میرا ہاتھ بٹا سکیں۔ آمین

مدیر

"تصوف" مذہب عشق و محبت ہے۔ صوفیائے کرام خدا کو ہر شے کی حقیقت مانتے ہیں اور وجود غیر حق کے قائل نہیں۔ اس بنا پر وہ نہ کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ اور نہ کسی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں

جملہ معشوق است و عاشق پروۂ
زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

اس لئے ان کا مسلک صلح کل ہوتا ہے۔

لیکن عشق خدا کا عطیہ ہے۔ وہ کسب سے حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اللہ والوں کی محبت اور ان کی صحبت میں بیٹھنے اٹھنے سے وہ چنگاری جو اللہ کا عطیہ ہوتی ہے شعلہ بن جاتی ہے۔ عشق و محبت کی بنیاد پر جو مسلک قائم ہو، وہی حق و حقیقت ہے۔ باقی چیزیں جو اس کی غیر ہیں، محض قیل و قال اور مایۂ جنگ و جدال ہیں۔

جذبۂ عشق کی بدولت عارف مستغرق عالم وصال ہوتا ہے اس کے عقیدے کے مطابق "ہستی" عشق ہے اور عشق "ہستی" ہے

درکون و مکان ہیچ نہ بینم جز عشق — پیدا و نہاں ہیچ نہ بینم جز عشق
حاشا کہ ز سرِ عشق غافل مائم — چوں در دو جہاں ہیچ نہ بینم جز عشق

اگر عشق نہ ہوتا تو جو ظاہر ہوا ظاہر ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ حقائق اشیاء صور تجلیات ہیں، اس کی شرح حدیث کُنتُ کنزاً مخفیاً الخ کے تحت اکابر صوفیائے کرام کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

عشق انسان کی فطرت ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اس لئے روتا ہے۔ کہ اُسے اپنی اصل سے دوری شاق گذرتی ہے رفتہ رفتہ اس کی توجہ ماں باپ کی محبت پھر اپنے گرد و پیش کی محبت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور وہ ان "اضافات" میں الجھ کر اپنی اصل کو بھول جاتا ہے۔ لیکن جب اللہ کا فضل ہوتا ہے تو وہ پھر اللہ سے محبت کرنے لگتا اور محبان الٰہی کے راستے پر چل کر اصل سے جا ملتا ہے۔ ورنہ مرنے کے بعد اس کی روح عالم برزخ میں اور اس کے بعد بھی عذاب الٰہی میں گرفتار رہتی ہے برکات ذکر و شغل اور مراقبات کی بدولت انسان کی روح کا تعلق ذات الٰہی کے ساتھ قوی ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ اسے اپنے قرب کی دولت سے نوازتا ہے۔

حضرت ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع میں آیات قرآنی مثلاً قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳-۳۱) یعنی اے رسولؐ۔ مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ۔ (۲-۱۶۵) یعنی اور جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ کی محبت میں قوی تر ہیں۔ (یعنی اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں)۔۔۔ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ احوال محبت کی تین قسمیں ہیں۔

اوّل:۔ جذبۂ محبت عوام۔ جو اللہ کے احسان کی بدولت بندہ کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کا قلب عموماً اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جو اس پر کوئی احسان کرے۔

دوم:۔ صادقین و متحققین کی محبت ہے جو اللہ پاک کی شان بے نیازی۔ اس کے جلال اس کی عظمت و قدرت اور اس کے علم پر نظر رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

سوم:۔ صدیقینؒ و عارفینؒ کی محبت ہے جو کمال عرفان کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں اکثر صوفیہ کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ جب تک محب کو اپنی محبت کا علم ہوتا رہتا ہے۔ اس کی محبت صحیح نہیں ہوتی۔

اللہ کی محبت اپنے بندوں کے ساتھ اس کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح بندے پر بھی لازم ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اللہ سے محبت کرے اور اس کے صلہ میں کسی انعام و اکرام کی تمنا نہ رکھے حتیٰ کہ اسے اس امر کا بھی ہوش نہ رہے کہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ ایسی محبت اس وقت صحیح ہو سکتی ہے جبکہ محبوب کے سوا اور کچھ خیال دل میں باقی نہ رہ جائے

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "محبت عبارت از آں است کہ صفات محبوب جانشین صفات محب شود" اور وہ یعنی محب اس کے مصداق ہو جائے کہ "حتیٰ احبہ فاذا احببتہ کنت عینیہ الذی یبصر بہ وسمعہ الذی یسمع بہ ویدہ الذی یبطش بہ (حتیٰ کہ میں اس سے محبت کروں۔ پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا کان بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ پکڑتا ہے۔

سرور اولیائے چشت، ہند الولی عطائے رسولؐ۔ خواجہ خواجگان غریب نواز حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری قدس سرہ العزیز اپنی ایک تالیف موسوم بہ "گنج اسرار" میں فرماتے ہیں" اے عزیز۔ زبان سے یاد کرنا یا ذکر کرنا علم قال ہے۔ جب تک سالک صادق عقل[1]

---

[1] مراد عقل جزوی یا عقل استدلالی۔ جو محبت الٰہی کی ترقی میں مانع ہوتی ہے۔

سے فارغ نہیں ہوتا۔ استقامت اور محبوبیت حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب تک کثرت سے اطاعت باطن میں مستغرق اور محو نہیں ہوتا۔ کمالیت قرب الٰہی حاصل نہیں ہوتی۔ حس و عقل دو مقام ہیں دونوں کا خدا کی طرف راستہ نہیں ہے۔ یہ دونوں مقامات قال کے ہیں۔ عالم ناسوت و ملکوت قال ہیں اور عشق و علم (لدنی) حال ہیں۔ قرب حق کا قال سے تعلق نہیں۔ خزانۂ اسرار حقیقت دل سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ زبان سے۔ [معرفت چہارم (ترجمہ معین الارواح صفحہ ۲۵۷]

"اے عزیز! یہ فقیر کہتا ہے کہ کمال عشق یہ ہے کہ اپنی ہستی کو معشوق کی ہستی دیکھے۔ یعنی اپنی ہستی کا حجاب از راہ عشق عاشق کے دل سے دور ہو جائے جس طرح ایک شمع کو ہزار آئینوں میں دیکھنے سے ہزار شمعیں نظر آتی ہیں۔ مگر دراصل ایک ہی شمع سب میں ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی نور کا جلوہ دو آنکھوں میں ہے" [معرفت دوازدہم۔ معین الارواح صفحہ ۲۶۵]

"سالہا سال سے یہ فقیر (حضرت خواجہؒ) یار کی کمند زلف میں اسیر ہے، اور جان و تن ہدف ناوک ہیں۔ اگرچہ بعض سالکان راہ حقیقت فراق میں جلا کرتے ہیں لیکن یہ فقیر عین وصال میں ہلاک ہے۔ عاشق و معشوق کے دو نام ہیں۔ عاشق کا مقام تلوین[1] ہے معشوق کا مقام تمکین[2]۔ جب عاشق درمیان خود کو نہیں دیکھتا تو اسے اپنی ہستی معشوق نظر آتی ہے۔ اور جب معشوق کو درمیان نہیں دیکھتا۔ تو اُسے اپنی ہستی عاشق نظر آتی ہے یعنی "خدا از تو بتو نزدیک تر است۔"

یہ مقام انتہائے اتحاد و محبت ہے۔ اسی مقام پر منصورؒ نے انا الحق اور حضرت بایزیدؒ نے سُبحانی ما اعظم شانی فرمایا پس عارف خود سے خود کو دیکھتا ہے۔ خود سے کلام کرتا ہے۔ خود سے خود سنتا ہے اور خود سے خود کو طلب کرتا ہے۔ جب طالب لا موجود الا اللہ کا مقام از رہ عشق طے کر لیتا ہے۔ تو سوائے ذات مطلق کے اور کچھ بھی نہیں رہتا۔ مگر جو محبت کا دعویٰ کرے اور اپنے آپ کو درمیان دیکھے وہ مسلک عشق میں کافر ہے۔ جاننا چاہئے کہ دل دریچہ راہ عشق ہے اور "اور وہ خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔" ... اہل ظاہر از راہ عقل یہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا ہے وہ ہمہ جا حاضر ہے۔ اور ہر حال میں موجود ہے۔ مگر صرف اس باشتہ سے اتصال مع اللہ اور قرب خدا حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ محض دل و جان سے جس راہ کو اختیار کرتے ہیں۔ وہ بلا تلقین مرشد حاصل نہیں ہو سکتی۔ مرشد کامل کی صحبت و تربیت اور ربط کے بغیر راہ عشق و محبت میں کمالیت و استغراق و مستی و محویت کے ساتھ قرب خدا حاصل کرنے کا دوسرا راستہ نہیں ہے۔" [معرفت سیزدہم۔ معین الارواح صفحہ ۲۶۶]

صوفیائے کرام کے عقیدے کے بموجب "انسان" عبارت ایک ایسی چیز سے ہے، جو معشوق حقیقی سے عقیدت رکھے۔ اس کی صفات اختیار کرے حتیٰ کہ اُسی ذات میں گم ہو جائے (ان کے نزدیک جس شخص میں یہ صفات نہ ہوں، یا جو اس کی کوشش نہ کرے وہ "انسان" کہلانے کا مستحق ہی نہیں) بقول حضرت عطارؒ :-

از شبنم عشق خاک آدم گل شد — صد فتنہ و شور در جہاں حاصل شد
صد نشتر عشق بر رگ روح زدند — یک قطرہ ازاں چکید و نامش دل شد

اس موضوع پر اکابر صوفیہؒ کے اقوال بے حد و حساب ہیں، کیونکہ تصوف کی بنیاد ہی عشق حقیقی پر قائم ہے۔ ان کے نزدیک کوئی مذہب

---

[1] تلوین، مقام طلب ہے۔ اس میں مغلوب الحالی کے دورے آتے جاتے رہتے ہیں ایک سا حال نہیں رہتا۔ گہے گریاں گہے خنداں گہے حیران گہے نالاں بجز ایں شغل یک لحظہ نبودے روزگارمن [2] تمکین، مقام استقرار ہے اس میں سالک صاحب مقام ہوتا ہے اور مغلوب الحال نہیں ہوتا۔

مذہب عشق حقیقی سے بہتر نہیں نہ کوئی آئین محبت سے برتر ہے۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست — ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب — درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

عشق حقیقی ہی وہ نسخہ ہے جو حرص و ہوس اور جملہ امراض روحانی سے انسان کو نجات بخشتا ہے اسی عشق سے بندۂ خاکی ہستی افلاک بنتا ہے اور خاک کی پستیوں سے نکل کر نور کی بلندیوں پر پہنچتا ہے چنانچہ عارف رومیؒ فرماتے ہیں۔

ہر کہ را جامہ ز عشقے چاک شد — او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علت ہائے ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

مختصر یہ کہ عشق حقیقی ہی سالک کا مقصود اصلی ہے۔ باقی تمام مقامات از قسم توبہ، زہد، ورع، صبر، شکر، خوف، شوق اور انس وغیرہ اسی عشق و محبت کے ثمرات ہیں، حتیٰ کہ طاعت بھی محبت ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک عشق نہ ہو عبادت اور معرفت دونوں بے کار ہیں۔ ابلیس کا واقعہ مثال کے لئے کافی ہے اسے معرفت بھی حاصل تھی اور اس نے عبادت بھی بے انتہا کی تھی، انہی اوصاف کی بدولت وہ مقبولان بارگاہ الٰہی میں شامل تھا۔ لیکن ان اوصاف کی بنیاد عشق حقیقی پر قائم نہ تھی۔ ورنہ اس سے وہ نافرمانی سرزد نہ ہوتی۔ جس کے باعث وہ مردود بارگاہ ازلی ہوا۔ اس نے عاشقانہ فرمانبرداری کے بجائے منطقی استدلال اور حجت سے کام لیا۔ یہی چیز اللہ تعالیٰ کی خفگی کا باعث ہوئی۔ خطا تو حضرت آدمؑ سے بھی سرزد ہوئی تھی، لیکن انہوں نے عشق و انکساری کا مظاہرہ کیا اور ندامت و گریہ کے ساتھ معافی کے خواستگار ہوئے لیکن ان کی خطا ہمیشہ کے لئے معاف کر دی گئی۔ اور اس طرح معاف کی گئی کہ ان کی اولاد سے یہ دنیا آباد ہوئی۔ ان کی تعلیم کے لئے انبیائے کرامؑ مبعوث ہوئے جو ابلیس کے مکائد سے ہمیشہ اولاد آدم کو آگاہ کرتے رہے۔ اور اس کے مکر و فریب سے بچ کر اللہ کی محبت میں زندگی گزارنے والوں کو اللہ ارحم الراحمین نے دونوں جہاں کی نعمتیں عطا فرمائیں۔

اسی لئے صوفیہ کے نزدیک صرف خدا مستحق محبت ہے، وہ حبّ الٰہی کو انسان کا فرض سمجھتے ہیں۔ اور جو شخص خدا سے محبت سب سے زیادہ نہیں کرتا۔ وہ ان کے نزدیک "انسان" کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

موازنۂ عقل و عشق

عشق اور عقل کا موازنہ، بالخصوص معرفت حق تعالیٰ کے سلسلے میں نہایت ضروری ہے عقل کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً عقل اوّل، عقل کلی۔ عقل استدلالی یا جزوی وغیرہ یا بقول عارف رومیؒ عقل جمادی۔ عقل نباتاتی، عقل حیوانی، عقل انسانی اور عقل نبوی۔ حکما کی طرح صوفیائے کرام بھی عقل و حکمت کی اہمیت کے قائل ہیں، مگر ان کے یہاں عقل و حکمت وسیع معنوں میں مستعمل ہے، سائنس و فلسفہ میں استعمال ہونے والی عقل کو وہ عقل جزوی کہتے ہیں، بعض حضرات نے اسے عقل معاش بھی کہا ہے، یہ عقل خدا کو نہیں پہچان سکتی۔

عشق کا بلند تر مقام عقل جزوی سے ماوریٰ ہے (اس کے خلاف نہیں) یہاں (یعنی مقام عشق میں) استدلالی عقل سوخت ہو جاتی ہے۔ زماں و مکاں کی حقیقت، اعراض کے جواہر، آغاز و انجام حیات، حقیقت حیات، حقیقت وجود، حقیقت روح، وحی

الہام وغیرہ ایسے عقیدے ہیں، جنہیں عقل جزوی یعنی عقل استدلالی حل نہیں کر سکتی۔

صوفیائے کرامؒ جسے عقل ایمانی کہتے ہیں، وہ عام عقل انسانی سے بہت بلند ہے۔ اسے یا عقل نبوی کو عقل استدلالی سے سمجھنے کی کوشش کرنا ناممکن ہے، یہ سمجھ روحانی تجربات کا ثمرہ ہے۔ ان تجربات کی ابتدا عشق سے ہوتی ہے۔ عقل اور عشق کا موازنہ کرتے ہوئے اکابر صوفیہ اور دیگر شعرائے کرام نے ہزارہا اشعار لکھے ہیں۔ یہاں صرف چند اشعار عارف رومیؒ کے لکھے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

عقل جزوی عشق را منکر بود   گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود
زیرک و داناست اما نیست نیست   تا فرشتہ لا نشد اہرمنی ست

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن   دست در دیوانگی باید زدن
آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را
داند او کو نیک بخت و محرم است   زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است
زیرکی بفروش و حیرانی بخر   زیرکی ظن است و حیرانی نظر

علامہ اقبال فرماتے ہیں:-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل   دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

عشق کے بلند مقامات میں بھی ایک قسم کی عقل کارفرما ہے، بلکہ اسے صوفیائے کرامؒ نے "حیرانی" اور بعض نے جنوں کہا ہے، علامہ اقبال ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:-

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر   شریک زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

"خرد" کے مقابلے میں "جنوں" "عشق حقیقی" ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ صوفیائے کرام کی اس "حیرانی" یا "جنوں" کو عام عقل انسانی کے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کرنا ایک قسم کی جہالت ہے۔ کیونکہ جس طرح عقل جمادی عقل نباتی کو، عقل نباتی عقل حیوانی کو اور عقل حیوانی عقل انسانی کو سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح عام عقل انسانی عقل ایمانی یا عشاق کی حیرانی کو بھی نہیں سمجھ سکتی۔

عشق حقیقی والی زندگی کی سطح عام سطح حیات سے بہت بلند ہوتی ہے۔ اور برتر درجہ حیات میں عقل و شعور اور فہم و ادراک کی نوعیت اور اس کے پیمانے بدل جاتے ہیں،

روح کے اندر تمام حقائق حیات مضمر ہیں، جب حرص و ہوس اور غلط اندیشی کے غلاف قلب کے آئینہ سے دور ہو جاتے ہیں تو حقیقت منعکس ہو جاتی ہے یہ علم "نور الٰہی" ہے اور اسے حاصل کرنے کا ذریعہ "عشق حقیقی" ہے، جس کا پہلا مرحلہ "تزکیہ نفس" ہے" مظاہر حیات کے ظاہری روابط دریافت کرنے کا علم جسے سائنس کہتے ہیں "تزکیہ نفس" اور "عشق حقیقی" کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اس سے "اسرار حیات" منکشف نہیں ہوتے۔ نہ اس سے خود اپنی عقل کا پتہ چلتا ہے"

عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن   یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں   (اقبال)

حکماء اور فلاسفہ کا علم انبیائے کرام کے علم سے مختلف ہوتا ہے۔ حکماء و فلاسفہ کا علم ظنی اور مظاہر حیات سے متعلق ہوتا ہے لیکن انبیائے کرام کا علم یقینی ہوتا ہے اور وہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کے عقدے کھول دیتا ہے۔ خالص طلب حق پیدا ہو جانے کے بعد ایسے حقائق منکشف ہوتے ہیں جن کے حصول کے لئے کسی خارجی واسطے مثلاً کتب وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی، اسی لئے صوفیائے کرامؒ نے "عشق" کو "اُم الکتاب" کہا ہے ؎ "علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُمّ الکتاب" (اقبال) کیونکہ کتابی علم ثانوی حیثیت رکھتا اور زندگی کے صرف سطحی رنگ و روغن کا کام کرتا ہے۔ "تزکیۂ نفس" سے معرفت حق تعالیٰ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن معرفت بھی اصل مقصود نہیں ہے۔ اصل مقصود "قرب" یا "وصال حق" ہے۔ اس قرب کی کوشش یا کشش کا نام "عشق" ہے، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ:۔

(۱) ارتقائے حیات کے ساتھ عقل بھی ارتقا پاتی ہے۔

(۲) اسلامی فقر و تصوف کی رو سے حیات انسانی کا ارتقاء تزکیۂ نفس اور اصلاح قلب پر منحصر ہے۔

(۳) ادنیٰ تر درجۂ حیات کی عقل اعلیٰ تر درجۂ حیات میں کام نہیں آتی۔ اور

(۴) اعلیٰ ترین منزل حیات میں عقل اور عشق مترادف ہو جاتے ہیں۔ مگر وہاں عقل کا نام "جنوں" یا "حیرانی" ہوتا ہے،

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

اس کی ایک توضیح یوں بھی کرتے ہیں کہ موجودات میں طبقات ہیں، ہر طبقہ موجودات میں اسی کی مناسبت سے ایک درجۂ عقل کارفرما ہے۔ جو بلند تر طبقۂ وجود کی عقل کے مقابلے میں ناقص ہوتی ہے۔ عقل الٰہی عقل کُل ہے۔ جو تمام طبقات وجود کی ناظم اعلیٰ ہے، انسان کی کوشش یہ ہونا چاہئے۔ کہ وہ محسوسات سے وابستہ جزوی عقل کو ترقی دے کر معقولات تک پہونچے اور معقولات سے بلند ہو کر قلب و روح سے کام لے (تزکیہ و تصفیہ کے ذریعہ) اور اس طرح "عقل کل" سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اسی طرح اسرار حیات کھل سکتے ہیں،

یہی نظریہ عارف رومی کا ہے۔ اور امام غزالیؒ نیز دیگر اکابر صوفیہ نے اسی کی تائید کی ہے، موجودہ دور کے بعض فلاسفر مثلاً کانٹ اور برگساں بھی اس کے قائل ہیں، کہ عقل جزوی یا استدلالی اسرار حیات تک نہیں پہونچ سکتی۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے وجدان یا (مسلم صوفیائے کرام کے) عشق کی ضرورت ہے،

ہم نے قوسین میں "مسلم صوفیائے کرام" کی قید اس لئے لگائی ہے، کہ توحید و رسالت پر ایمان اور عشق رسول میں عنایت کے بغیر خدا رسی محال ہے۔ مسلم صوفیائے کرام کا "عشق حقیقی" اسی کا مترادف ہے۔ اور اسی سے غیر مسلم صوفیہ کے عشق میں امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ (بعض "غیر مسلم" صوفی بالخصوص جنہیں مسلم صوفیائے کرام کی تعلیم ہوتی ہے بظاہر۔ کسی مصلحت کی بنا پر غیر مسلم نظر آتے ہیں۔ لیکن دراصل ان کا قلب مُسلم ہوتا ہے۔ وہ ہماری ہر بات پر ایمان کامل رکھتے اور حضورؐ کی محبت میں سرشار رہتے ہیں۔ بعض نعتیہ کلام لکھ کر بھی اپنی محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں بعض نہیں کرتے۔ علمائے ظاہر کو اس صورت حال پر اعتراض ہوتا ہے۔ لیکن صوفیائے کرام قلب پر نظر رکھتے اور اسی کو نہ کہ ظاہر کو مرکز ایمان و محبت سمجھتے ہیں، نیز وہ تالیف قلوب کے ذریعہ فتح قلوب کے قائل ہیں۔ اسی لئے ابتدا میں سختی نہیں کرتے۔ رفتہ رفتہ مجاہدات کا عادی بنا دیتے ہیں۔)

بعض اوقات عقل جزوی اپنی حد کے اندر رہ کر اعلیٰ ترین درجۂ وجود کی عقل یعنی "عشق" اور اس کے انکشاف پر معترض ہوتی یا اس کی تضحیک کرتی ہے۔ یا خود واقف اسرار ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس وقت اس میں ابلیسیت پیدا ہو جاتی ہے "زیرکی را ابلیس و عشق از آدم است" اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ کیونکہ عقل جزوی اندھوں کی طرح حیات کے ظاہر کو صرف ٹٹول سکتی ہے۔ اُسے "حیرانی عشق" پر معترض ہونے یا اس کی تضحیک کا کوئی حق نہیں ہے۔ "حیرانی عشق" سراپا نظر ہوتی اور چشم بینا بن کر اسرار حیات کا مشاہدہ کرتی ہے۔

عقل انسانی کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ مقصود حیات کو پہچانے۔ مقصود حیات رب کی ملاقات ہے۔ "اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ" (الانشقاق) اس کا طریقہ یہی ہے۔ کہ انسان ادنیٰ قوتوں کو اعلیٰ کے ماتحت کرتا رہے۔ ادنیٰ زندگی کو اعلیٰ زندگی میں مدغم کرے (فنا فی الشیخ۔ فنا فی الرسولؐ۔ فنا فی اللہ اسی کے مختلف مراحل ہیں) اسی کا نام عشق حقیقی ہے۔ اور اسی طرح انسان کی ادنیٰ قوتیں اعلیٰ کے زیر اثر آ کر خود اعلیٰ بن جاتی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی اصول کارفرما ہے۔ خواہ اس شعبہ کا تعلق تعلیم و تربیت سے ہو خواہ صنعت و حرفت سے۔ خواہ زراعت و تجارت سے شاگرد اپنی ادنیٰ ذہنی قوتوں کو اپنے استاد کی اعلیٰ ذہنی قوتوں کے تابع رکھتا ہے حتیٰ کہ اس کی ذہنی استعداد خود ترقی پا کر اُستاد کی ذہنی سطح پر آ جاتی ہے۔ اسی کا نام ارتقاء ہے۔ کائنات کی ہر چیز اسی اصول کے ماتحت ارتقاء پاتی ہے۔ جمادات نباتات میں فنا ہو کر، نباتات حیوانات میں فنا ہو کر اور حیوانات انسان میں فنا ہو کر ارتقا حاصل کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا انسان بھی اُسی وقت اعلیٰ تر مخلوق بن سکتا ہے۔ جب اپنے سے اعلیٰ تر قوتوں میں فنائیت کا درجہ حاصل کرے۔ یہ فنائیت عشق حقیقی کی راہ پر چل کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

محض فلسفہ، منطق، سائنس، یا کسی بھی شعبۂ حیات کا ظاہری علم یہ نہیں بتا سکتا کہ آگے کا قدم کس طرف اُٹھایا جائے کیونکہ انسان کا ارتقاء باطنی معنوی ہے۔ جس کی ابتدا قیل و قال سے آگے ہے۔

اگلا قدم کس طرف اٹھایا جائے یہ عارفین کا روحانی تجربہ ہے۔ اس تجربے کی بنا پر انہوں نے جو راہ متعین کی ہے وہ صدیوں کی آزمودہ اور کامیاب ہے۔ دوسروں کو ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھا کر ان کی مقرر کردہ راہ اختیار کرنا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ ان کی طرح منزل حقیقی پر پہونچنے کی واقعی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ قرآن پاک فرماتا ہے فاسئلوا اھل الذکر اِن کنتم لا تعلمون (النحل ع ۶) یعنی پس دریافت کرو اہل ذکر سے اگر تم نہیں جانتے۔ یہاں "اہل علم" نہیں کہا۔ "اہل ذکر" فرمایا گیا ہے جس سے مراد "عاشقان الٰہی" ہی ہیں۔

عصر حاضر کے عظیم ترین مفکر ڈاکٹر اقبال نے اپنے سینکڑوں اشعار میں اسی امر پر زور دیا ہے۔ ذیل میں صرف چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ کیا شیدائیان اقبال اور وہ حضرات جو علوم ظاہر کو توشۂ آخرت سمجھے ہوئے ہیں اور اسلامی نظام تربیت کو ہیچ باور کرتے ہیں ان اشعار پر غور فرمائیں گے،

دل ز دین سرچشمۂ ہر قوت است — دین ہمہ از معجزات صحبت است
دین مجو اندر کتب اے بے خبر — علم و حکمت از کتب دین از نظر
صحبت از علم کتابی خوشتر است — صحبت مردان حُر آدم گر است

(مسافر)

می نروید تخم دل از آب و گل بے نگاہے از خداوندانِ دل
اندریں عالم نیرزی با خسے تا نیاویزی بداماں کسے

(پس چہ باید کرد)

رابطۂ قلوب :- سنت الٰہی یونہی جاری ہے کہ چراغ سے چراغ جلے اور قلوب سے قلوب روشن ہوں۔ چنانچہ عشق الٰہی کی آگ تیز کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکمل پیروی کی جائے۔ قال رسولؐ کی بھی اور حال رسول کی بھی — دراصل قال رسولؐ کی پیروی بھی اسی لئے کی جاتی ہے، کہ وہ اصلاح قلب کا خاص ذریعہ ہے، سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذہب و مسلک کا اصل مقصود اصلاح قلوب تھا۔ آپؐ کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ لوگ صرف آپ کے الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کریں۔ آپؐ نے بھی زندہ شخصیتیں ہی تیار کی تھیں۔ اور انہی نورانی شخصیتوں کی بدولت انسانی قلوب کی اصلاح ہوئی اور بندگان خدا خدا تک پہونچے۔

(باقی آئندہ)

حقیقتِ تصوف

بزبانِ حقائق ترجمانِ واقف آیاتِ یزدانی،
اخویم مکرم غلام غوث صاحب صمدانی مدظلہ العالی
۶۔۸ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور

مَا التصوف؟ پرتوِ اخلاقِ اوؐ اکتسابِ نور، از آفاقِ اوؐ
مَا التصوف؟ اتّباعِ مصطفٰےؐ در اصول و کار و حالِ دل معا
ھست ینبوعُ التصوّف ذاتِ او اولیاء باشند از آیاتِ اوؐ
اِتباعِ حالِ، بس لازم بود طبقِ کیفِ دل ہمہ فتوی رود
نیست سُنّت محض در سجدہ سجود سُنّتِ اوؐ ہست ہم ترکِ وجود
ورنہ یکساں بود آں کارِ ثواب
سجدۂ ابنِ اُبَیؔ و بوترابؓ[1]

[1] اگر محض ظاہری سجدہ معیارِ ایمان ہوتا تو عبداللہ ابن ابی (منافق)، اور حضرت ابوترابؓ دونوں کے سجدے یکساں قرار پاتے۔ ثابت ہوا کہ ایمان کے لئے تزکیۂ قلب لازمی ہے، تصوف اسی تزکیۂ قلب کا دوسرا نام ہے۔